درسِ قرآن کا قرآنی اسلوب

ڈاکٹر اختر حسین عزمی

اللہ نے قرآن کو آسان بنایا ہے: وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ (القمر ۵۴:۱۷)، البتہ قرآن اپنی تفہیم کے لیے انسانوں سے غور وفکر اور تدبر کا تقاضا کرتا ہے: اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا ﴿۲۴﴾ (محمد ۴۷:۲۴) ''کیا وہ قرآن پر غور نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر تالے چڑھے ہوئے ہیں؟''

عام طور پر غور وتدبر دماغ کا کام تصور کیا جاتا ہے، لیکن اس آیت سے قرآن پر غور وفکر دل اور دماغ کی یکجائی کے بغیر ممکن نہیں۔ قرآن کے مطابق حقیقی اندھا وہ نہیں جو آنکھوں کی بینائی سے محروم ہے بلکہ وہ ہے جس کا دل اندھا ہو چکا ہے: فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ ﴿۴۶﴾ (الحج ۲۲:۴۶) ''حقیقت یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتی ہیں، یہ سینوں میں موجود دل ہیں جو اندھے ہو جاتے ہیں''۔

اس آیت میں دل کا مقام بھی بتا دیا گیا ہے، جو سر نہیں، سینہ ہے۔ قرآن میں قلب کا لفظ محض خون کی پمپنگ مشین کے لیے نہیں، عقل وہوش اور جذبات کے متوازن وسیلے کے لیے استعمال ہوا ہے۔

اس حقیقت کے پیش نظر لازم ہے کہ بار بار تلاوت کر کے قرآن کے اسلوب کو اپنے اندر جذب کیا جائے اور قرآن کا درس قرآنی اسلوب ہی میں دیا جائے۔ یہ بات کہنے کی ضرورت اس لیے محسوس ہو رہی ہے کہ ہمارے ہاں درسِ قرآن تو بہت ہوتے ہیں، مگر اکثر دروس میں قرآن سے اخذ شدہ قرآنی اسلوب کم ہی نظر آتا ہے۔ واعظ کی اپنی نصیحت اور روایات کی بھرمار سے بوجھل درس اگر محض نکتہ آفرینیوں کا مجموعہ بن جائے، تو ایسے دروس کے ذریعے عوام الناس کی بڑی تعداد کو

قرآن سے نہیں جوڑا جا سکتا۔ محترم خرم مراد کے بقول مدرس کو چاہیے کہ وہ قرآن اور اپنے سامعین کے درمیان زیادہ حائل نہ ہو اور نکتہ آفرینیوں میں پڑنے کے بجائے اپنے سننے والوں کو آیت کے مفہوم سے جوڑے رکھے۔

قرآن کے اسلوبِ درس کے ضمن میں ذیل میں چند نکات پیش ہیں:

● **دل و دماغ کو اپیل:** قرآن پر گفتگو ہو یا تقریر، وہ دانش ورانہ لیکچر بن کر نہیں رہ جانا چاہیے، کیونکہ قرآن کا مجموعی انداز خطیبانہ اور واعظانہ ہے۔ خطیب جہاں عقلی دلائل سے عقل و شعور کو اپیل کرتا ہے، وہاں دل میں جذبات کو چھیڑ کر انسانوں کو عمل پر آمادہ بھی کرتا ہے۔

قرآن نے اپنے موقف کو مدلّل کرنے کے لیے عقلی دلائل بھی دیے ہیں اور نقلی دلائل بھی۔ یہ دلائل وہ ہیں جن کو ہر دور، ہر جگہ اور ہر علمی سطح کا انسان سمجھنے کے قابل ہے۔ جیسے: حضرت یوسفؑ کا اپنے قید کے ساتھیوں سے سوال: ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۳۹﴾ (یوسف ۱۲:۳۹) ''بہت سے متفرق رب بہتر ہیں یا وہ ایک اللہ جو سب پر غالب ہے؟'' لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ (الانبیاء ۲۱:۲۲) ''اگر آسمان و زمین میں ایک اللہ کے سوا دوسرے خدا بھی ہوتے تو ان دونوں کا نظام بگڑ جاتا''۔

یہ دونوں دلائل اتنے سادہ اور عام فہم ہیں کہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو یا بالکل اَن پڑھ، وہ بھی توحید کا اقرار کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اسی طرح آخرت کے انعقاد اور عدالت الٰہی کے قیام پر اس دلیل کا کوئی ایک بھی انکار نہیں کر سکتا: اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ ﴿۳۵﴾ مَا لَكُمْ ۫ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ﴿۳۶﴾ (القلم ۶۸: ۳۵-۳۶) ''کیا ہم فرماں برداروں کا حال مجرموں جیسا کر دیں؟ تمھیں کیا ہو گیا ہے، یہ تم کیسے حکم لگاتے ہو؟'' هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۭ (الزمر ۳۹:۹) ''کیا علم والے اور بے علم برابر ہو سکتے ہیں؟''

بہت سی طبیعتیں عقلی دلائل کی طرف تو رجحان نہیں رکھتیں، لیکن تاریخی مقامات و قصص سے عبرت پکڑتی ہیں، گویا انھیں نقلی دلائل متاثر کرتے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں حضرت آدم اور ابلیس، ہابیل و قابیل، طوفانِ نوحؑ، عاد و ثمود کی تباہی، ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کی سرگزشت، قومِ لوط پر عذاب، موسیٰؑ و فرعون کا معرکہ، موسیٰؑ و خضرؑ کا مکالمہ، بنی اسرائیل کا طرزِ عمل، اصحابِ کہف، ذوالقرنین،

اصحاب الاخدود اور اصحاب الفیل کے عبرت آموز واقعات بیان ہوئے ہیں جن سے عرب مانوس تھے۔ اہل عرب نے یا تو ان مقامات وکھنڈرات کو دیکھا ہوا تھا، یا وہ جن قوموں سے میل جول رکھتے تھے، ان کے ہاں یہ واقعات زبان زدِ عام تھے۔

اس لیے درس دیتے وقت شرکا کے مشاہدے کا بھی لحاظ رکھنا ہوگا۔ سائنسی اکتشافات اور فلسفیانہ استدلال، سامعین کو قرآن سے جوڑنے کے بجائے دُور کرنے کا باعث بنتا ہے۔

● **آیات کی تکرار:** تعلیم وتربیت کرنا دنیا میں سب سے مشکل کام ہے۔ انسان ایک جذبات رکھنے والی مخلوق ہے جو کبھی نصیحت کی طرف مائل ہوتی ہے تو کبھی پند ونصائح سے بیزار دکھائی دیتی ہے۔ کبھی غم کی تصویر ہے تو کبھی مجسم خوشی۔ یہی وجہ ہے کہ تعلیم وتربیت کا ایک ہی لگابندھا طریقِ کار ہر انسان کے لیے کارگر نہیں ہوسکتا۔ اس لیے ضروری ہے کہ تعلیم کا یہ عمل ایک خشک مشق نہ بننے پائے۔ قرآن حکیم کا مقصد تعلیم اور تزکیہ وتربیت ہے، اس لیے اس کا طرزِ بیان کسی طرزِ تحریر کے بجائے خطیبانہ، واعظانہ اور معلّمانہ ہے، فرمایا: وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ط (الکہف ۱۸:۵۴) ''ہم نے اس قرآن میں لوگوں کو مثالیں بدل بدل کر سمجھایا ہے''۔

قرآن کے بنیادی موضوعات توحید، رسالت اور آخرت بار بار بیان ہوئے ہیں، عموماً ایک موضوع کی تکرار اور تعلیم وتدریس کا ایک ہی انداز سامعین اور قارئین کے لیے اکتاہٹ کا باعث بنتا ہے۔ اس لیے قرآن ایک ہی موضوع کو سمجھانے کے لیے اس کے مختلف پہلوؤں کو مختلف مقامات پر مختلف انداز میں بیان کرتا ہے۔ جیسا کہ فرمایا: اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ ﴿۶۵﴾ (الانعام ۶:۶۵) ''دیکھو! ہم کس طرح بار بار مختلف طریقوں سے اپنی آیات ان کے سامنے پیش کر رہے ہیں تاکہ یہ حقیقت کو سمجھ لیں''۔

تکرار سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ اللہ کے نزدیک تصریفِ آیات کس قدر ضروری ہے۔ ایک مدرس کے لیے ضروری ہے کہ ہر مرتبہ نئے ڈھنگ اور آہنگ کے ساتھ درس کو ترتیب دے۔ یعنی نئی مثالوں، نئے واقعات اور نئے دلائل سے اپنی گفتگو کو مزین کرے اور زبان و بیان کی ایسی یکسانیت سے بچنے کی کوشش کرے جو اس کے سامعین میں اکتاہٹ پیدا کرنے کا باعث بن سکتی ہو۔

● **سوال اُٹھانا:** کبھی قرآن انسان کو تدبّر پر یوں اُبھارتا ہے اور ان کی حوصلہ افزائی کرتا ہے: یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ، اور کبھی یَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ کہہ کر جواب دیتا ہے۔ کبھی انسان کو چونکانے کا یہ انداز ہے: وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ۝ ثُمَّ مَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ۝ (الانفطار ۸۲: ۱۷-۱۸) اور کبھی اَلْقَارِعَةُ ۝ مَا الْقَارِعَةُ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَةُ ۝ (القارعۃ ۱۰۱: ۱-۳)۔ کبھی ایک ہی مضمون کے فہم کے لیے مختلف مثالیں بیان کرتا ہے۔ کبھی انسانی عقل کو اس طرح بھی اپیل کرتا ہے: اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ ۝ مَا لَكُمْ ۖ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ۝ (القلم ۶۸: ۳۵-۳۶) ''کیا ہم اطاعت گزاروں اور مجرموں کو برابر کر دیں گے؟ تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ تم ایسے فیصلے کرتے ہو؟'' فرمایا: هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۭ (الزمر ۳۹: ۹) ''کیا علم والے اور بے علم برابر ہو سکتے ہیں؟''۔

کبھی انسانی فطرت میں برائی کے لیے موجود کراہت کو یوں انگیخت دیتا ہے کہ غیبت کے گھناؤنے پن کو نمایاں کرنے کے لیے یہ سوال سب کے سامنے رکھتا ہے:

اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا (الحجرات ۴۹: ۱۲) کیا تمھارے اندر کوئی ایسا بھی ہے جو اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانا پسند کرے؟

ایک اچھے معلّم و مربی کا یہی طریقہ ہے کہ وہ محض نصیحت اور زجر و توبیخ ہی نہ کرے بلکہ انسانی طبیعت میں برائی سے نفرت اور نیکی کی طرف رغبت کا جو جذبہ موجود ہے، اسے بھی اُبھارے۔

● **صفاتِ الٰہی کی تکرار:** قرآن میں جہاں بھی نیکی کا حکم دیا گیا ہے یا برائی سے منع کیا گیا ہے، وہاں ساتھ ہی اس کی مناسبت سے صفات الٰہی کا ذکر بھی ضرور موجود ہے، تاکہ انسان اپنے آپ کو ان صفات کے آئینے میں دیکھ کر اللہ کی قدرت اور اپنی پوزیشن کا تعین کرے۔ قرآن میں معاشرت و معیشت کا کوئی بھی قانون بیان کیا گیا ہے تو اسے محض قانون کی کتاب کی طرح خشک انداز میں شق وار بیان نہیں کیا، بلکہ انسانوں کو تقویٰ اختیار کرنے اور احسان کی روش اپنانے کی نصیحت بھی کی گئی ہے۔

سورۃ النساء آیت ۳۴ میں جہاں یہ بیان ہوا کہ ''مرد عورتوں پر نگران ہیں'' وہاں ساتھ مردوں کو یہ یاد دہانی کرا دی گئی کہ تمھیں اگر عورتوں پر بالادست اور صاحبِ اختیار بنایا گیا ہے، تو

اپنے اختیارات استعمال کرتے ہوئے اپنے اوپر اپنے رب کی پکڑ کا بھی دھیان رکھنا کہ وہ تم سے بھی زیادہ بالادست ہے۔

● **ترغیب و ترہیب:** قرآن میں قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ کہنے کے ساتھ مومنوں کی چیدہ چیدہ صفات کا تذکرہ کیا گیا۔ سورۂ فرقان میں عبادالرحمٰن کی صفات کا بیان بھی شوق انگیز ہے۔ یہ بیان کیا گیا کہ رحمٰن کے بندے تو ان ان صفات کے حامل ہوتے ہیں، تاکہ ہر انسان اپنے کردار کا خود جائزہ لے کہ وہ رحمن کا بندہ کہلانے کا حق دار ہے یا شیطان کا بندہ کہلانے کا سزاوار؟

قرآنی تربیت کا ایک انداز یہ بھی ہے کہ وہ ہر لمحہ فرد میں اُمید اور خوف کی کیفیت کو اس طرح قائم رکھتا ہے کہ انسان نہ تو خدا کی گرفت سے بےخوف ہو سکے اور نہ اس کی رحمت و مغفرت سے مایوس ہو جائے۔ چنانچہ جہاں اس نے عذابِ جہنم کا ذکر کیا ہے ساتھ ہی جنت کی بشارت اور اس کی نعمتوں کا تفصیلی تذکرہ بھی کیا ہے۔

قرآن میں بنیادی انسانی اخلاقیات کو اُبھار کر بھی اسلامی عقائد و اصولوں کی افادیت اور فرضیت کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔ جیسے سورۃ الماعون میں یوم جزا کو جھٹلانے والے کی اس بدخلقی کا ذکر ہے کہ وہ نہ تو یتیم کو کھانا کھلانے کی ترغیب دیتا ہے اور نہ روزمرہ کے استعمال کی چھوٹی موٹی اشیا عاریتاً کسی کو برتنے کے لیے دیتا ہے۔ کبھی ان کے سامنے دو قسم کے کردار رکھ کر خود ان میں سے اپنے لیے کسی کردار کا انتخاب کرنے کا راستہ دکھایا گیا ہے۔ جیسے سورۂ بقرہ کی آیت ۲۰۴ سے ۲۰۷ میں پہلے باتوں سے دل موہ لینے والے ایک دنیا پرست انسان کا ذکر ہے۔ پھر اس کے برعکس ایک کردار ایسے شخص کا ہے جو محض رضائے الٰہی کے حصول کے لیے اپنی جان تک کو داؤ پر لگائے رکھتا ہے۔

● **ثانوی بحثوں میں نہ اُلجھنا:** قرآن کا ایک اسلوب یہ ہے کہ وہ اپنے بیان میں اپنے مدعا و مقصد پر مرکوز (Focus) رہتا ہے۔ اس سے متعلقہ ثانوی درجے کی باتوں کو اہمیت نہیں دیتا۔ سورۂ کہف میں زندگی بعد از موت کے وقوع کو ثابت کرنے کے لیے اللہ نے اصحاب کہف کا واقعہ بیان کیا۔ تورات اور اسرائیلی روایات کے زیر اثر عیسائیوں میں اور ہمارے ہاں بھی اس بات پر بحث ملتی ہے کہ ان کی تعداد کتنی تھی؟ قرآن نے اس بحث کا ذکر کیا ہے:

سَيَقُوْلُوْنَ ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْمًۢا بِالْغَيْبِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ سَبْعَةٌ وَّثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ ۭ (الکہف ۱۸:۲۲) کچھ لوگ کہیں گے کہ وہ تین تھے اور چوتھا ان کا کتا تھا۔ اور کچھ دوسرے کہیں گے وہ پانچ تھے اور چھٹا ان کا کتا تھا۔ یہ سب بے تکی ہانکتے ہیں۔ کچھ اور لوگ کہتے ہیں کہ وہ سات تھے اور آٹھواں ان کا کتا تھا۔

آیت کی تفسیر میں مولانا مودودی لکھتے ہیں: ''مطلب یہ کہ اصل چیز ان کی تعداد نہیں ہے بلکہ اصل چیز وہ سبق ہیں جو اس قصے سے ملتے ہیں۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ ایک سچے مومن کو کسی حال میں حق سے منہ موڑنے اور باطل کے سامنے سر جھکانے کے لیے تیار نہ ہونا چاہیے۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ مومن کا اعتماد اسبابِ دنیا پر نہیں بلکہ اللہ پر ہونا چاہیے۔ ان سے توجہ ہٹا کر اس کھوج میں لگ جانا کہ اصحابِ کہف کتنے تھے اور کتنے نہ تھے اور ان کے نام کیا کیا تھے اور ان کا کتا کس رنگ کا تھا؟ یہ ان لوگوں کا کام ہے جو مغز کو چھوڑ کر چھلکوں سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے نبیؐ کو اور آپؐ کے واسطے سے اہل ایمان کو یہ تعلیم دی کہ اگر دوسرے لوگ اس طرح کی غیر متعلق بحثیں چھیڑیں بھی تو تم ان میں نہ الجھو، نہ ایسے سوالات کی تحقیق میں اپنا وقت ضائع کرو۔ اپنی توجہ صرف کام کی بات پر مرکوز رکھو۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ نے خود ان کی صحیح تعداد بیان نہیں فرمائی تاکہ شوقِ فضول رکھنے والوں کو غذا نہ ملے''۔ (تفہیم القرآن ج ۳، ص ۲۰)

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو فرمایا: وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۳۵ (البقرۃ ۲:۳۵) ''اس درخت کے قریب نہ جانا ورنہ ظالموں میں شمار ہوگے''۔

اب یہ درخت کون سا تھا؟ اسرائیلی روایات کے زیر اثر ہمارے ہاں اس پر بحثیں ہوئیں کہ گندم کا تھا یا انجیر یا کوئی اور۔ لیکن اللہ نے آدمؑ کو آزمانے اور یہ دکھانے کے لیے کہ شیطان اسے کس کس طریقے سے بہکائے گا، ایک درخت کو مقرر کر دیا۔ اب اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ کون سا درخت ہے؟ لہٰذا، قرآن اور صحیح احادیث میں اس درخت کے نام کی کوئی بحث نہیں ملتی۔

● **امثال اور واقعات:** قرآن کے اسلوب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اگرچہ عقائد و نظریات کے برحق ہونے پر استدلال کیا گیا ہے، لیکن اس کا طرز استدلال فلسفیوں کی طرح

محض تجریدی نہیں بلکہ تمثیلی اور واقعاتی ہے۔ اللہ نے بات سمجھانے کے لیے مکھی، مچھر، مکڑی جیسی معمولی اشیا کی مثالیں دی ہیں۔ شہد کی مکھی، گھوڑوں، خچروں اور گدھوں کی سواریوں کو ربّ نے کس طرح انسانی خدمت میں لگایا ہوا ہے، اس کا ذکر کیا ہے۔

سورج، چاند، ستاروں، شجر و حجر اور سمندروں کو کس طرح انسان کے لیے مسخر کر دیا ہے؟ جب کہ اپنے اچھے اعمال کو شرک کے ذریعے گدلا کر دینے والے کو اس عورت سے تشبیہ دی ہے جو محنت سے کاتے ہوئے سوت کو خود ہی ضائع کر دیتی ہے۔ موقف کو مدلّل کرنے کے لیے انبیاؑ اور ان کی مخاطب اقوام کے مکالمے اور واقعات بیان کیے ہیں۔ اس لیے قرآن کی طرف بلانے والے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے درس میں محض عقلی و فکری دلائل ہی نہ دے بلکہ اپنے استدلال کو مثالوں، تاریخی واقعات اور روزمرہ زندگی کے ہلکے پھلکے واقعات سے مزین کرے۔ اس لیے کہ ہر دور کا انسان قصے کہانیوں سے دلچسپی رکھتا ہے اور واقعات سے سبق حاصل کرتا ہے۔

● **فکر آخرت کی عملی ترجیح:** قرآن کے بیان کردہ عقائد کی منطقی ترتیب میں اوّلین عقیدہ توحید پر ایمان ہے۔ مگر عملی اعتبار سے عقیدۂ آخرت کی غیر معمولی اہمیت ہے کیونکہ کسی سزا کے خوف اور اجر کی اُمید کے بغیر حق پرستی مشکل ہے۔ نزولِ قرآن کے ابتدائی دور کی سورتوں میں توحید سے زیادہ عقیدۂ آخرت یعنی قیامت، حشر و نشر، میزان اور جنت و دوزخ کا ذکر زیادہ غالب ہے۔ مکی دور کی ابتدائی سورتیں جو کہ زیادہ تر اٹھائیسویں، انتیسویں اور تیسویں پارے میں ہیں، وہ ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔ اس لیے ایک مدرس اگر شرک آلودہ لوگوں کو سچا توحید پرست بنانا چاہتا ہے تو پہلے مرحلے میں اسے ان لوگوں میں فکرِ آخرت کا احساس جگانا ہوگا کیونکہ انکارِ توحید کی اصل اور بنیادی وجہ انکارِ آخرت ہی ہے۔

● **اخلاقیات اور سماجی اقدار کا احیاء:** ہمارے ہاں درس و تبلیغ میں اکثر احکامِ شرعی کے بیان میں فقہی پہلو غالب آجاتا ہے، جب کہ قرآن نے اپنے نزول کے ابتدائی تیرہ سال میں شرعی پابندیوں کی بات نہیں کی۔ زورِ تاکید زیادہ تر اخلاقیات اور انسانی و سماجی اقدار کو اُجاگر کرنے پر رہا۔ معاشرے کے کمزور طبقات یتیموں، مسکینوں، غلاموں، مسافروں سے ہمدردی، سچائی، امانت، سخاوت، پابندیٔ عہد، والدین اور رشتہ داروں سے حُسنِ سلوک کی تاکید جابجا نظر آتی ہے:

اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ ۝ فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ ۝ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۝ (الماعون ۱۰۷:۱-۳) تم نے دیکھا اس شخص کو جو آخرت کی جزا وسزا کو جھٹلاتا ہے؟ وہی تو ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کا کھانا دینے پر نہیں اُکساتا۔

كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ ۝ وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۝ وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا ۝ وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ۝ (الفجر ۸۹: ۱۷-۲۰) بلکہ تم یتیم کی تکریم نہیں کرتے اور مسکین کو کھانا کھلانے پر ایک دوسرے کو نہیں ابھارتے اور میراث کا سارا مال سمیٹ کر کھا جاتے ہو اور مال کی محبت میں بری طرح گرفتار ہو۔

جب اہل جنت دوزخیوں سے پوچھیں گے کہ تمھیں کیا چیز دوزخ میں لے گئی تو اس کی ایک وجہ یہ بیان کریں گے: وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ ۝ (المدثر ۷۴: ۴۴) ''اور ہم مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے''۔

یتیم و مسکین کے صرف کھانے پینے کی ہی ضرورت کو پورا کرنا کافی نہیں، انسان ہونے کے ناطے وہ عزت و تکریم کے بھی مستحق ہیں۔ عموماً کمزوروں کو دینے والے ان کی بے توقیری کر رہے ہوتے ہیں۔ قرآن نے اسے انسان کی ایک بڑی خامی بتایا ہے: كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ ۝ (الفجر ۸۹:۱۷) ''ہرگز نہیں، بلکہ تم یتیم کی عزت کرتے ہی نہیں''۔

یتیم اور ضرورت مند سائل کی عزّتِ نفس کے خیال رکھنے کی ہدایت نزول قرآن کے ابتدائی دنوں سے آپؐ کو کی جارہی تھی، فرمایا: فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ ۝ وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ ۝ (الضحیٰ ۹۳: ۹-۱۰) ''پس یتیم پر سختی نہ کرو اور سائل کو نہ جھڑکو''۔

ایسا صدقہ جس میں ضرورت مند کو ذہنی اذیت دی جائے، اسے تو نہ دینا بہتر ہے۔ فرمایا: قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ۔ (البقرۃ ۲:۲۶۳) ایک میٹھا بول اور (ضرورت مند کی کسی ناگوار بات پر) چشم پوشی اس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے دُکھ ہو۔